ایسا نہیں چلے گا''، جیسے عنوانات کے تحت آج کے ایک زندہ مسئلے کو موضوع بحث بنایا ہے۔

کتاب کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ فاضل محقق بلدئ فکر کے ساتھ زبان و بیان پر بھی گہری گرفت رکھتے ہیں۔ بعض جملے اتنے شاندار ہیں کہ گویا دریا کوزے میں بند کر دیا گیا ہو اس نوعیت کے جملے بجا طور پر ان کو ''اقوالِ زریں'' میں شمار کرنے کے لائق ہیں۔ چند جملے ملاحظہ ہوں:

﴿ہمارا علاج قیمتی باتوں میں نہیں، ضروری باتوں میں ہے۔﴾

﴿انسانی تعمیر سے دلچسپی میں مبتلا احباب کو علیم سے زیادہ حکیم ہونا ضروری ہے۔﴾

﴿لوگ اس خیال پر جمے بیٹھے ہیں کہ تبدیلی حکمران بدلنے سے آئے گی حقیقت مگر یہ ہے کہ حکومت ہمارے بدلنے سے بدلے گی۔﴾

﴿مدرسوں میں بندگی کو چھوتا ہوا ادب ایک طرف طلبہ کے مزاج میں پستی پیدا کر رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف اساتذہ میں غرور بڑھا رہا ہوتا ہے۔﴾

﴿قربانی کسی ''صاحبِ نصاب'' کے ''عمل'' کے طور نہیں بلکہ اپنے ''وفا شعاروں'' کی ''ادا'' کے طور پر ہی محبوب ہے۔﴾

اس وقت زیر نظر کتاب پر تفصیلی تبصرہ مقصود نہیں ہے تاہم مختلف مضامین پر نظر ڈالنے سے کتاب کی اس خصوصیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ''درِ ادراک'' ایک طرف ہمارے ہاں منفی سماجی رویوں کا بیان ہے تو دوسری طرف اصلاح معاشرہ کی کوششوں اور طریق کار پر ایک شاندار استدراک بھی ہے۔ توقع ہے کہ کتاب اپنے اسلوبِ بیان اور مصنف کے گہرے سماجی مطالعے اور تنقیدی نظر کی وجہ سے قارئین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگی۔

مدارس میں غیر نصابی سرگرمیاں

طلبہ کے سماجی اور تعلیمی رجحانات کا ایک جائزہ

صفحات: ۱۳۲

زیر اہتمام

پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس اسٹڈیز

پوسٹ بکس نمبر 2110، اسلام آباد

pips@pakpips.com / 051-8359475-6

حالات وواقعات

مولانا مفتی محمد زاہد*

دینی مدارس میں عصری تعلیم کے تجربات ونتائج

[۱۴؍نومبر ۲۰۱۷ء کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ اور اقبال انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ فار ریسرچ اینڈ ڈائیلاگ (IIRD) کے اشتراک سے ''دینی مدارس میں عصری تعلیم کے تجربات ونتائج'' کے عنوان پر منعقدہ سیمینار میں گفتگو]

بعد الحمد والصلوٰۃ!

میں سب سے پہلے تو مخدوم ومکرم حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب، جناب مولانا عمار خان ناصر صاحب، الشریعہ اکادمی کے ذمہ داران اور ادارہ اقبال برائے مکالمہ وتحقیق کے ذمہ دار حضرات کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس محفل میں حاضری کا اور اپنی گزارشات پیش کرنے کا موقع عنایت فرمایا۔ میں انتہائی مختصر وقت میں چند موٹی موٹی باتوں کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کروں گا۔

دینی مدارس میں عصری تعلیم کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ یا کیا ہونا چاہیے؟

اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس زمانے میں بچے کی سوشلائیزیشن یعنی بچے کو اپنی سوسائٹی کا، اپنے سماج کا حصہ بنانا کہ بچے کو اپنے معاشرے کی اقدار، معروف ومنکر اور رہن سہن کا علم ہو، یہ مقصود ہوتا ہے۔ اس طرح کے کام عموماً بچے کو والدین سکھایا کرتے تھے، لیکن آج کے دور میں بچے کی سوشلائیزیشن کا عمل بھی تعلیمی اداروں ہی کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ دینی مدارس میں ابتدائی عصری تعلیم کا ایک مقصد یہ ہوسکتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی مقصد ہونا چاہیے کہ ہمارے جتنے بھی بچے ہیں اور بڑے ہو کر جس لائن میں بھی وہ جانے والے ہیں، چاہے وہ عالم دین بننے والے ہوں، انجینئر بننے والے ہوں یا ڈاکٹر بننے والے ہوں، ان کی جو ابتدائی سوشلائیزیشن ہو رہی ہے، وہ تقریباً یکساں ہو۔ اگر ہمارا بچہ شروع میں اسکول کی تعلیم سے بالکلیہ ناواقف ہوگا تو اس بات کا امکان موجود رہے گا کہ وہ اپنے آپ کو سوسائٹی کا مکمل طور پر حصہ نہ سمجھ سکے۔

دوسری طرف بھی اس چیز کی ضرورت ہے کہ اسکول میں دینی بنیادی تعلیم، قرآن کی تعلیم کو لازمی حصہ بنایا جائے۔ کہنے کی حد تک تو یہ حصہ ہے، لیکن اس کو فعال اور متحرک بنانے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں مختلف تجربات مختلف جگہوں پر ہوئے ہیں۔ مثلاً بہت ساری جگہوں پر حفظ کے ساتھ ساتھ ایک آدھ گھنٹہ نکال کر بچے کو اسکول کی تعلیم دے

* شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ امدادیہ، فیصل آباد

دی جاتی ہے اور تھوڑے وقت میں بچہ بہت کچھ کور کر لیتا ہے۔ ایک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اصلاً تو بچہ اسکول جا رہا ہوتا ہے، لیکن پارٹ ٹائم قرآن کریم حفظ کر رہا ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں بلکہ کامیاب مثالیں موجود ہیں۔

عام طور پر اس طرح کی چیزوں میں سب سے بڑا سوال یہ اٹھتا ہے کہ حفظ کی تعلیم کے ساتھ اگر دوسری چیز اٹیچ ہو گی یا دوسری تعلیم کے ساتھ حفظ اٹیچ ہو گا تو حفظ کمزور رہے گا، لیکن حفظ کے کمزور رہنے یا نہ رہنے کا دارومدار اس چیز پر ہوتا ہے کہ حافظ بننے کے بعد اس نے قرآن مجید کی طرف توجہ کتنی دی ہے۔ اگر کچا پکا یا درمیانہ سا یاد ہے لیکن زندگی بھر خاص طور پر رمضان میں اگر وہ قرآن کی طرف متوجہ رہتا ہے تو اس کا حفظ ٹھیک ہوتا ہے۔ ایک تیسرا تجربہ ہے، ہمارے ہاں بھی اس پر عمل ہو رہا ہے، اور بھی کئی جگہ پر اس پر عمل ہو رہا ہے۔ وہ یہ کہ وہ بچہ داخل کیا جائے جو پرائمری پاس ہو یعنی ابتدا میں بچہ ناظرہ پڑھنے کے لیے مسجد میں بے شک جائے، لیکن حفظ کے لیے مدرسے میں قاری صاحب کے حوالے کرنے کی بجائے وہ روٹین میں اسکول ہی جائے، ابتدا میں ہم نے رعایت رکھی تھی کہ اساتذہ کے بچوں کو ہم ابتدا ہی سے حفظ میں داخل کر لیتے تھے اور ایک استاد ان بچوں کے لیے مقرر کر دیا تھا، لیکن وہ تجربہ بھی اتنا کامیاب نہیں ہوا۔ اب ہم اپنے اساتذہ کو بھی کہتے ہیں کہ اپنے بچوں کو پرائمری تک اسکول میں پڑھاؤ۔

اس کے مختلف اسباب ہیں جن میں سے ایک تو یہ کہ قاری صاحب کی درس گاہ میں جو جلال کا غلبہ ہوتا ہے، چھوٹے بچے کے لیے وہ ماحول شاید اتنا زیادہ سازگار نہ ہو۔ دوسرے ماحول میں وقت گزار کر آئے گا تو بہت سی چیزیں سیکھا ہوا ہو گا اور ان پر محنت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ دوسرا یہ کہ اتنے چھوٹے بچے کی لرننگ کی رفتار سست ہوتی ہے، اس کی سست رفتاری کو اپنے یا قاری صاحب کے ذمہ ڈالنے کی بجائے ابتدائی تعلیم اسکول میں عام ماحول میں ہی ہو تو بہتر ہے۔ بچہ پانچویں پڑھ چکا ہو گا تو اس کو حروف کی شناخت ہو چکی ہوتی ہے، سمجھ دار ہو چکا ہوتا ہے، وہ اڑھائی تین سالوں میں حفظ مکمل کر سکتا ہے۔ اس کی بہت ساری مثالیں ہیں بلکہ ایک سال میں حفظ کرنے کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ کرتے ہیں اور بہت ساری جگہوں پر یہ ہو رہا ہے کہ چھٹی، ساتویں، آٹھویں کے مشکل مضامین تھوڑے تھوڑے کر کے ساتھ پڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ بچہ جب حفظ سے فارغ ہوتا ہے تو تھوڑی سی ٹیوشن پڑھ کر مڈل کا امتحان دے لیتا ہے۔ اس کے بعد پھر اس کے لیے آگے راستہ کھلا ہوتا ہے۔

اس سے اوپر کی تعلیم میں کئی مقاصد پیش نظر ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ عصری تعلیم کی ایسی سند موجود ہو جو سرکاری طور پر مسلمہ ہو۔ اس سے دینی مدرسے کے فارغ التحصیل کے لیے یونیورسٹیز میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے راستے کھل جائیں گے اور الحمدللہ جب سے یہ راستے کھلے ہیں، اس کے بہت سارے اچھے فوائد اور ثمرات نظر آئے ہیں۔ دوسری چیز یہ پیش نظر ہوتی ہے کہ ہمارے مدارس اور مساجد میں شاید افراد کے کھپانے کی اتنی گنجائش نہیں ہے جتنی بڑی تعداد دینی مدارس سے الحمدللہ فارغ ہو رہی ہے۔ جو فارغ التحصیل، ہیں ان کے لیے روزگار کے مواقع ہونے چاہئیں تو اس حوالے سے بھی عصری تعلیم کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ یہ تعلیم روزگار میں کتنی کارگر ہے، یہ ایک الگ بحث ہے، لیکن بہر حال یہ سوچ ذہن میں ہوتی ضرور ہے۔

اس سلسلے میں ایک مستقل مجلس الشریعہ اکادمی میں ہو چکی ہے کہ فضلائے کرام کے معاشی مسائل کا حل کیا ہو؟ اس سلسلے میں، میں یہ عرض کروں گا یہ صرف ہماری تعلیم ہی کا مسئلہ نہیں ہے، ہماری جو مین اسٹریم ایجوکیشن ہے، اس میں بھی یہ مسئلہ ہے کہ صرف نوکری کرنا سکھلایا جاتا ہے، اس کے علاوہ بچے کو اور کچھ نہیں سکھایا جاتا، حالانکہ تھوڑا سا بزنس مائنڈ بنانا ضروری ہوتا ہے۔ اگر ایک فارغ التحصیل عالم نے کسی اور لائن میں جانا ہی ہے تو اگر وہ کچھ بزنس مائنڈڈ ہوگا تو بجائے اس کے کہ وہ کسی سے روزگار مانگے، وہ روزگار دینے والا بن جائے گا۔ اس کے علاوہ عصری تعلیم سے متعلق کچھ خالص دینی مقاصد بھی ہوتے ہیں اور یہ جتنی بھی بحثیں ہیں، اصل مقصد ضرور ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے۔ اصل مقصود وہ متبحر، عمیق علم رکھنے والے، رسوخ فی العلم رکھنے والے علماء پیدا کرنا ہے جو ہر زمانے کے مطابق لوگوں کو اللہ کی طرف، اللہ کے رسول کی طرف بلا سکیں اور دینی امور میں لوگوں کی رہنمائی کر سکیں۔ یہ ایک مستقل مقصد ہے اور اس کے لیے الگ انداز سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ محض کوئی سند یا ڈگری حاصل کر لینا شاید اس کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس دور کے جو چیلنجز ہیں، کچھ کلامی نوعیت کے ہیں، کچھ فقہی اور قانونی نوعیت کے ہیں، سماجی اور معاشرتی نوعیت کے ہیں، معاشی نوعیت کے ہیں، دعوتی نوعیت کے ہیں۔ ہر ایک کو سامنے رکھ کر اس کے حساب سے الگ سے تعلیم کا بندوبست کرنے کی ضرورت ہے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد بہت سارے مدارس ایسے ہیں جن میں اولیٰ کے سال کو دو حصوں میں تقسیم کر کے باقاعدہ میٹرک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ کافی حد تک اچھا اور کامیاب تجربہ ہے، لیکن میری معلومات کی حد تک اس میں دو تین مسائل پیش آ رہے ہیں۔ ایک مسئلہ تو وہی ہے جس کا حضرت مولانا مفتی حامد حسن صاحب نے ذکر فرمایا تھا کہ ایک استاد رکھا تو اس کے نتیجے میں طلباء چلے گئے۔ اپنا استاد ہو تو یہ مسئلہ ذرا کم ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ اس وجہ سے ہے کہ گھر والے بچے کو یہ سوچ کر مدرسے میں بھیجتے ہیں کہ یہ کوئی زیادہ صلاحیت رکھنے والا بچہ نہیں ہے، لیکن یہاں چونکہ وہ چوبیس گھنٹے ہماری نگرانی میں ہوتا ہے، محنت کرتا ہے، پڑھتا ہے، اس کی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے تو وہ میٹرک میں بہت اچھے نمبر لے لیتا ہے اور بعض اوقات والدین کی توقعات سے بہت بڑھ کر نمبر لے لیتا ہے تو والدین کا ذہن دوسری طرف چلنا شروع ہو جاتا ہے کہ اچھا! ہمیں تو اب پتہ چلا کہ ہمارا بچہ ذہین ہے۔ اگر یہ ذہین ہے تو اسے ایف ایس سی کرانی چاہیے، اس کو کسی اور طرف لگانا چاہیے۔ اگرچہ یہ بچہ ابتداء میں مدرسے میں پڑھ کر کسی اور طرف بھی چلا گیا تو دین کی جو بنیاد اس کے اندر پڑ گئی ہے، وہ ان شاء اللہ اس کے ساتھ رہے گی، لیکن پھر بھی ہم نے اس پر محنت کی ہے، ہمارے ہی کام آئے اور آخر تک ہمارے پاس ہی پڑھے، یہ ہمارا ایک مقصد ہو سکتا ہے۔ تو اس میں اگر ہمارے اپنے اساتذہ ہوں، وہ ترغیب سے کام لیں تو اس مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے ایک چیز محسوس کی گئی ہے، ہمارا اپنا ذاتی تجربہ بھی ہے کہ آپ اولیٰ میں عربی زبان کے قواعد پڑھاتے ہیں یا اسے دو سالوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، اگرچہ دورانیہ اتنا ہی ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود قواعد میں، صرف و نحو میں کچھ نہ کچھ کمی ضرور رہ جاتی ہے۔ یہ قابل غور ہے اور اس کا حل ہونا چاہیے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ دار العلوم دیوبند میں تعلیمی سال

کا اختتام شعبان کے آخر میں ہوتا تھا۔ پچیس شعبان کے لگ بھگ امتحان ہوتے تھے۔ دینی مدارس میں تعلیمی سال چھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔ شعبان کا پہلا ہفتہ امتحان کا ہوتا تھا، اب رجب کے آخری ہفتہ بلکہ آخری عشرہ کی طرف آنے لگ گئے ہیں، اور دوسری طرف بعض مدارس میں تعلیم کا آغاز بھی ذرا دیر سے ہوتا ہے۔ تو تعلیمی سال کو دوبارہ بڑھانے کی طرف توجہ دیں تو اس مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے ایک تجربہ یہ بھی کیا کہ اولیٰ میں جو میٹرک والے طلبہ ہیں، ان کو ہم رمضان سے ایک دو دن پہلے چھٹی دیں، لیکن باقی مدرسے میں چھٹی ہو چکی ہوتی ہے۔ چند ایک کو جب رکھتے ہیں تو وہ ایک نیا ماحول محسوس کرتے ہیں، اس میں ان کا دل پوری طرح لگانا، ان کو پڑھائی پر لگانا بھی اچھا خاصا کام ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم جس لیول پر بھی ہو، ایک اہم مسئلہ تاریخوں کا clash ہوتا ہے، انہی تاریخوں میں بورڈ کے امتحان ہو رہے ہوتے ہیں، انہی تاریخوں میں وفاق کے امتحان ہو رہے ہوتے ہیں۔ قمری و شمسی حساب کی وجہ سے بعض اوقات تاریخیں تقریباً اکٹھی ہو جاتی ہیں۔

میٹرک کے بعد میرے علم کے مطابق تین ماڈلز چل رہے ہیں۔ ایک یہ کہ میٹرک کر کے طالب علم دورہ حدیث تک اب اپنے آپ کو روک کر رکھے، اس دوران مزید کسی اور طرف توجہ نہ دے۔ بہت ساری جگہوں پر یہ ماڈل روبہ عمل ہے اور اس کے اپنے فوائد، اثرات اور نتائج ہیں۔ دوسرا ماڈل ہے کہ عصری تعلیم کو باقاعدہ اپنے نظام کا حصہ بنا لیا جائے، وہاڑی میں جامعہ خالد بن ولید میں، جامعۃ الرشید میں، اسلام آباد کے اندر مولانا فیض الرحمٰن عثمانی کے ہاں، جامعہ حنفیہ بورے والا میں ایسا ہی ہے اور اس طرح کی کئی اور مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں۔ تیسرا ماڈل یہ ہے کہ ادارہ اپنی طرف سے کوئی اس طرح کا انتظام نہیں کرتا، لیکن طلبہ کو مشروط طور پر اجازت دے دیتا ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں جامعہ امدادیہ میں گذشتہ سال کی حاضریوں کا ریکارڈ دیکھا جاتا ہے، گزشتہ تعلیمی سال میں امتحانات میں نمبروں کی ایک مخصوص حد متعین کی جاتی ہے تاکہ پتہ چلے کہ اس تعلیم میں توجہ کیسی ہے اور ایک یہ کہ چھٹی جو ملے گی، وہ صرف امتحان دینے کی ملے گی، تیاری کا زیادہ حصہ شعبان رمضان کی یا دیگر چھٹیوں میں مکمل کرنا ہوگا۔

لیکن ان تینوں ماڈلز میں بھی مسائل ومشکلات ہیں۔ ممانعت والے میں یہ ہے کہ دورہ حدیث کے بعد اس گیپ کو اگر طالب علم کور کرنا چاہے تو سال زیادہ لگتے ہیں اور کسی جگہ سیٹل ہونے میں وقت زیادہ لگ جاتا ہے۔ عمر کا مسئلہ بھی اس میں آ جاتا ہے۔ اپنے طور پر تیاری کے ماڈل میں ایک مشکل یہ پیش آ رہی ہے کہ بچے چھٹیوں کے دوران اپنے گھروں میں کسی استاد سے تیاری کر رہے ہوتے ہیں یا تعلیم کے ساتھ ہی عصر کے بعد یا کسی اور وقت اپنے طور پر کسی کے پاس جا کر تیاری کر رہے ہوتے ہیں۔ دو قسم کی تیاریوں میں یکسانیت بعض اوقات نہیں ہوتی، اس سے تیاری کے سلسلے میں طالب علم کے ذہن پر اضافی بوجھ پڑتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ایک بالکل مختلف ماحول میں کچھ دیر کے لیے طالب علم کو جانا پڑتا ہے۔ اصل ضرورت اس چیز کی ہے کہ بحیثیت مجموعی پورے سسٹم اور پورے نظام پر طویل اور وسیع پیمانے پر مشاورت ہو اور وسیع غور وفکر ہو۔

اس کی دو جہتیں ہیں۔ ایک تو مدارس، وفاق ہائے مدارس، تنظیمات ہائے مدارس کی سطح پر۔ اگر ہم اپنی پہلی